سوال

(20)اللہ تعالی کہاں ہے ؟

جواب

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عالم کہتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالی کو بلاکیف مستوی علی العرش مانے وہ کافر ہے حالانکہ اللہ تعالی ہر ایک آدمی کے سینے میں موجود ہے جس طرح حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا

اللہ تعالی، زمین اور آسمان کی پیمائش مت کریں صرف مسلمان مرد کے دل کی پیمائش کریں ۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالی عرش پر نہیں ہے بلکہ ہر ایک آدمی کے سینے میں ہے آیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟بینوابدلیل توجروبالجرا الجلیل ۔

الجواب بعون الوہاب بشرط صحة السؤال

وعلیکم السلام ورحمة اللہ وبرکاتہ!

الحمد للہ، والصلاة والسلام علیٰ رسول اللہ، أما بعد!

قرآن کریم میں کتنی ہی جگھوں پر اللہ تعالی کا عرش عظیم پر مستوی ہوناثابت ہے مثلا سورة اعراف میں اللہ تعالی فرماتے ہیں :

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (الاعراف:٥٤)

"بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کوچھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا۔ "

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (یونس:٣)

"بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کوچھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا۔ "

للّٰہُ لَّذِی رَفَعَ لسَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَہَا ثُمَّ ستَوٰی عَلَی لْعَرْشِ (الرعد:٢)

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنھیں تم دیکھتے ہو، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ ''

الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی (طہ:٥)

''وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔''

الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (الفرقان:۵۹)

''وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا۔''

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (السجدہ:٤)

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔''

هوالَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (الحدید:٤)

"وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔"

ان تمام آیات میں اللہ تعالی کا عرش عظیم پر مستوی ہونا واضح طور پر ثابت ہے اور اللہ تعالی کا عرش پر استوی اس کی صفت ہے اور اللہ کی صفات کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم ،تابعین ، تبع تابعین اور سلف صالحین کا یہی مسلک ہے (یہی مسلک اصح اور اسلم ہے) کہ اللہ تعالی کی تمام صفات جو قرآن کریم سے اور صحیح احادیث رسول ﷺ سے ثابت ہیں ان کو ویسے ہی ماننا ہے جس طرح کتاب وسنت میں وارد ہوئی ہیں ۔ ان کی لغوی معنی تو ہمیں معلوم ہے لیکن ان کی کیفیت کے بارے میں نہ ہمیں کچھ معلوم ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ذریعہ یا وسیلہ ہے جس کی بنا پر ان کی کیفیت معلوم کر سکیں ۔ یہ مسلم قانون ہے کہ صفات ذات تابع ہوتی ہیں جب کہ اللہ جل و علی شانہ کی ذات پاک بے مثل ہے تو اس کی صفات بھی بے مثل ہوں گی، خالق اور مخلوق کی صفات میں صرف لفظی اشتراک ہے باقی معنی اور مفہوم کے لحاظ سے مخلوق کی صفات اس بے مثل ذات پاک کی صفات سے کوئی اشتراک نہیں رکھتی مثلا انسان کو بھی سمیع اور بصیر کہا گیا ہے جس طرح سورۃ الدہر کے اندر اللہ تعالی فرماتے ہیں :

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (الدھر:۲)

''یعنی انسان کو بھی سننے والا اور دیکھنے والا بنایا گیا ہے ۔''

اور ہاں ''سمیع اور بصیر'' اللہ تعالی کی بھی صفات ہیں مگر ان کے بارے میں اللہ تعالی سورہ شوری کے اندر فرماتے ہیں :

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (الشوری:۱۱)

''کہ اللہ تعالی سننے والا اور دیکھنے والا ہے لیکن اس کا سننا اور دیکھنا بے مثل ہے ۔''

یعنی سننے اور دیکھنے میں ہماری طرح آنکھوں اور کانوں کا محتاج نہیں ہے ۔ یہی حکم اللہ تعالی کی باقی تمام صفات کا ہے ۔ مثلا اللہ کا کلام کرنا، اللہ کا غضب اور رضا مندی، بندوں سے محبت کرنا ان پر غصہ کرنا۔

ید (ہاتھ) عین (آنکھ) وجہ (چہرا) وغیرہ تمام کو ویسے ہی ماننا ہے جس طرح کتاب وسنت میں وارد ہوا ہے ۔ نہ کہ ان کے اندر تاویل کی جائے گی اور نہ ہی ان کا معنی مفہوم ایسا لیا جائے گا جو مخلوق سے مشابہت کی طرف منتج ہو، درحقیقت اللہ تعالی کی صفات بھی متشابہات کے باب سے ہیں ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان متشابہات کے نزول اور بیان کا آخر مقصد کیا ہے کہ ہم انسانوں کو ان کے پورے مفہوم اور کیفیت کا علم ہی نہیں ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالی کی معرفت صرف اس کی صفات کے علم سے ہی حاصل

ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ ہم اللہ تعالی کو دیکھ نہیں سکتے ، مثلا کسی ملک کا بادشاہ ہو یا دوسری کوئی بڑی ہستی ہو وہاں تک لوگوں کی رسائی نہ ہو اور اس کے متعلق واقفیت صرف اس کی صفات سے ہو سکتی ہو، یعنی ہمیں علم کے صحیح ذرائع سے معلوم ہو کہ وہ بادشاہ عدل وانصاف والا ہے ، اپنی رعیت پر رحم کرنے والا ہے ، ان کی تکالیف پر خبر گیری اور مدد کرنے والا ہے ، وغیرہ وغیرہ تو اس کی ان خوبیوں کی اعلی صفات کی معرفت سے ہمیں اس کے بارے میں کافی حد تک صحیح علم ہو جاتا ہے ، اس لیے وہ عوام جس کو اپنے اس بادشاہ تک رسائی حاصل نہیں ان کے دل میں بھی یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بادشاہ جب رحم دل اور عدل وانصاف کا علمبردار ہے ظلم وزیادتی سے کنارہ کشی کرنے والا ہے تو ہماری مشکلات کی اگر اس کو اطلاع ہو گئی تو ضرور ہماری مدد کرے گا اور مشکل وقت میں ضرور ہمارے کام آئے گا ، اس کی ان خوبیوں اور کمالات کو مد نظر رکھ کر لوگ اس سے بے پناہ محبت کرنے لگتے ہیں ، اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالی جو کہ پوری مخلوق کا خالق ومالک اور حقیقی بادشاہ ہے جس نے اپنے بندوں کو آزمانے کے لیے اس دنیا میں مبعوث کیا اور اسی امتحان کی خاطر انہیں حکم کیا کہ وہ ان دیکھے ان پر ایمان لائیں غیب پر ایمان لائیں یہی وجہ ہے کہ اس دنیا فانی کی مخلوق اس فانی دنیا میں اللہ سبحانہ وتعالی کو نہیں دیکھ سکتی اور انسان جس چیز کو نہیں دیکھ سکتا آخر اس کے ساتھ تعلق کس طرح قائم کر سکتا ہے ؟ کس چیز کے ساتھ کسی کا تعلق یا تو اس کے حسن وجمال خوبیوں اور کمال کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے یا اس کی صفات حمیدہ اور اس کی بے شمار خوبیوں کے علم حاصل کرنے سے پیدا ہوتا ہے ، جبکہ ہم اللہ سبحانہ وتعالی کو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے اس لیے ان سے تعلق قائم کرنے کی صرف واحد صورت یہی بچتی ہے کہ ہمیں ان کی صفات اور اسمائے حسنی کا علم ہو جائے پھر جب بندے کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ہمارا رب اللہ خالق بھی ہے مالک بھی ہے تمام مخلوق کی پرورش بھی کر رہا ہے ان کو رزق بھی دے رہا ہے ، عدل وانصاف ولا ہے ، کسی پر ذرے برابر بھی ظلم نہیں کرتا ، بندوں پر رحم کرتا ہے ان سے محبت کرتا ہے اور ان کی فریاد رسی بھی کرتا ہے جب بھی اس کو پکارا جائے تو پکار کو سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے ۔ گناہوں کو معاف کرنے والا ہے رات کے آخری حصہ میں دنیا آسمان پر نازل ہو کر بندوں کو پکار پکار کر اپنے گناہوں اور خطاوں کی معافی طلب کرنے کا کہتا ہے ۔ اس کے علاوہ بہت ساری صفات حمیدہ کے علم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بندہ اپنا تعلق اللہ تعالی سے استوار کر لیتا ہے اور دل ہی دل میں اللہ تعالی سے محبت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کے دل میں اللہ تعالی کی اتنی محبت ہوتی ہے کہ دنیا کی کسی چیز سے اتنی محبت نہیں ہوتی ، قرآن کریم سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالی فرماتے ہیں :

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (البقرۃ:١٦٥)

''اور جو ایماندار لوگ ہیں وہ تو سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں ۔''

اہل ایمان کی اللہ تعالی سے بے انتہا محبت ہے اور یہ اتنی بڑی محبت یہ تعلق ورشتہ صرف اللہ تعالی کی صفات کے علم کا نتیجہ ہے ۔

سورۃ ذاریات میں اللہ تعالی فرماتے ہیں :

وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ (الذاریات:٥٦)

''کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے ۔''

اور ظاہر ہے کہ کسی کی عبادت اس کی معرفت کے بغیر تصور میں نہیں آسکتی ، تو اگر بندوں کو رب کی صفات کا علم نہ ہوتا تو اس کی عبادت کس طرح کر سکتے تھے ۔ جہمیہ وغیرہ نے اللہ تعالی کی صفات کا انکار کیا ہے درپردہ گویا اللہ سبحانہ وتعالی معاذاللہ کوئی چیز ہی نہیں ہے ۔ یا کوئی مستقل ہستی نہیں ہے کیونکہ انسان جو مشاہدات اس دنیا میں کرتا ہے جن کا تعلق چاہے جمادات یا نباتات کی اقسام سے ہو یا حیوانات ک باب سے حیوانات سے مراد جاندار چیزیں ہیں ۔ ان تمام کی کچھ نہ کچھ صفات ہیں موجودات میں سے کوئی بھی چیز صفات سے عاری نہیں ہے پھر اگر اللہ تعالی کی کوئی صفت ہی نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ (معاذاللہ) اللہ تعالی ایک موہوم چیز ہے ، جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے ، اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا کفریہ عقیدہ نہیں ہو سکتا ۔ دوسرے الفاظوں میں یوں سمجھیں کہ جو کوئی اللہ تعالی کی صفات کا انکاری ہے وہ گویا اللہ تعالی کے وجود کا انکاری ہے ۔ خلاصہ کلام کل بندوں کو اللہ کی بندگی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ذہنوں میں اللہ تعالی کی صفات کا علم ہو اور اس علم کے ذریعے ان کے دل اور دماغ میں اللہ تعالی کے متعلق صحیح یقین اور تصور قائم ہو سکے کہ میری یہ عبادت اس ذات پاک جل وعلی کے لیے ہے جس کی یہ یہ صفات ہیں اور اس سے یہ یقین قائم ہو گا کہ میں کسی موہوم چیز کی بندگی نہیں کر رہا بلکہ ایک ایسی ہستی کی بندگی کر رہا ہوں جو خود بھی موجود ہے اور دوسری مخلوق کو بھی قائم رکھے ہوئے ہے جو کہ ان ان صفات کمال سے متصف ہے ، اور صفات دو قسم کی ہیں ۔

(1)صفات ثبویہ (2)صفات سلبیہ

ان دونوں صفات کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ انسان کے دل میں اللہ تعالی کے بارے میں صحیح تصور قائم ہوسکے ، صفات ثبویہ سے مراد وہ صفات ہیں جو کسی ہستی میں موجود ہوں ، مثلااللہ تعالی کا غفور ، رحیم ، شکور ، ودود ، عادل ہونا اس قسم کی تمام صفات ثبویہ ہیں ۔ اوروہ صفات جن کا تعلق عیوب ، نقائص ۔ عجزوکمزوری ، ظلم ونا انصافی وغیرہم سے ہواس طرح کی صفات جس میں پائی جائیں وہ اس کے عیوب میں شمار ہوں گی ، لہذا جس طرح صفات جلال وکمال کی اثبات اللہ تعالی کےلیے ضروری ہے اس طرح ذات جل وعلی سے ان تمام صفات کی نفی بھی ضروری ہے جو نقص وعیوب پر دلالت کرنے والی ہوں ۔ اس کی صفات جلال وجمال کے خلاف ہوں ، ایسی صفات کو صفات سلبیہ کہا جاتا ہے مثلا سورۃ اخلاص میں اللہ تعالی فرماتے ہیں :

وَلَمْ يَكُن لَّهُۥ كُفُوًا أَحَدٌۢ (الاخلاص : ۴)

''یعنی اس کا کوئی ثانی یا برابری والا نہیں ہے ۔''

یعنی اللہ تعالی کی ذات ان تمام نقائص اوعیوب سے پاک ہے جو مخلوق کے اندر موجود ہیں جس طرح سورہ شوری میں اللہ تعالی فرماتے ہیں :

لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ (الشوری : ۱۱)

''اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے وہ سنتا اور دیکھتا ہے ۔''

لیکن اس کا سننا اور دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کا سمیع اور بصیر ہونا بے مثل ہے ۔ اسی طرح کتاب وسنت میں ہر اس صفت کی نفی کی گئی ہے جس میں ذرہ برابر نقص یا عیب کی بو آتی ہو ۔ اب خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اللہ نےاپنے بندوں کو اپنی عبادت کےلیے پیدا کیا ہے ۔ اور عبادت صحیح نمونے پر اس وقت ہوسکے گی جب معبود کا دل میں صحیح تصور قائم ہو یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی اوراس کے حبیب کبریا نے اللہ تعالی کی ان تمام صفات کا ذکر کیا ہے جن کی معرفت سے اللہ کے بارے میں جتنا علم ہوسکے وہ ہوجائے ۔ اب آپ کو معلوم ہوچکا ہوگا کہ متشابہات جن میں اللہ تعالی کی صفات بھی شامل ہیں ان کو اللہ نے کیوں بیان فرمایا ہے مثلا بندوں کو یہ بتایا کہ اللہ تعالی سمیع اور بصیر ہے ، اس لیے کہ بندے یہ جان لیں ان کا رب ہر حال میں دیکھ رہا ہے اور ہماری تمام دعائیں سن رہا ہے اوروہ مشکل کشا جل وعلی اپنے فضل وکرم سے ان کی دعا کو قبول کرے اوراس مشکل سے اس کو نجات دلائے ۔ اسی لیے انہیں بتایا گیا کہ

اللہ تعالی غفار ، غفور وغیرہ ہے اس لیے اگر بندوں سے خطائیں اور غلطیاں ہوں تو وہ مایوس بالکل نہ ہوں بلکہ ان کے دلوں میں وہ یقین اور امید باقی رہے کہ ہمارا مالک وحدہ لاشریک لہ ہے بہر حال بخشنے والا اور بے حد مہربان ہے ۔ اس لیے ہم اگر اس کی طرف رجوع کریں گے اور توبہ تائب ہوں گے تو وہ ضرور ہمیں اپنی مغفرت اور رحمت واسعہ سے نوازے گا ۔

اسی طرح دوسری صفات ثبوتیہ کو سمجھنا چاہئے ۔ کتاب وسنت میں ہمیں چند کلمات سکھائے گئے ہیں ۔ جو اللہ تعالی کی صفات کے متعلق ہمیں کافی اور شافی علم عطا کرتے ہیں جن کے پڑھنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے وہ کلمات یہ ہیں ۔ ''سبحان اللہ'' اس کلمہ میں اللہ تعالی سے ہر عیب ونقص اور خامی کی نفی کی گئی ہے ۔ یعنی یہ لفظ صفات سلبیہ کی طرف اشارہ کررہا ہے مگر کسی عیب کی صرف نفی اس کی معرفت کےلیے کامل نہیں ہوئی ۔ مثلا جس طرح کہا جائے کہ فلا شخص یا بادشاہ اندھا نہیں ہے یا لنگڑا نہیں ہے ۔ کانہ یا بدصورت نہیں ہے وغیرہ وغیرہ لیکن عیوب کی نفی کے باوجود سننے والے کے دل میں ابھی تک تشنگی باقی رہتی ہے لیکن جب اس صفات کو ثبوتیہ کا علم ہوجائے تو پھر وہ مطمئن ہوجاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اس ہستی کے بارے میں کماحقہ معرفت حاصل ہوگئی ہے اس لیے سبحان اللہ کے بعد الحمدللہ کا کلمہ سکھایا کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی صفات حمیدہ اورکمالات کا صاحب ہے کہ جس کی وجہ سے وہ واقعتا اور حقیقتا ہر چیز کی حمدوثنا وتعریف کا اہل ہے اس کے بعد تیسرا کلمہ اللہ اکبر ''کا سکھایا گیا ہے کہ انسان کو صفات سلبیہ اور ثبوتیہ کے علم حاصل ہونے کے باوجود اس کو یہ بھی معلوم ہوجائے کہ وہ خیالات ، تصورات اور وہم گمان سے بھی بڑا ہے ۔ اس لیے کہا گیا کہ اللہ ہر چیز سے بڑا ہے ۔ تاکہ انسان کے دل میں

اللہ تعالی کی عظمت اور کبریائی کا ایمان وایقان مزید پختہ ہوجائے کیونکہ کلمہ ''لاالہ الااللہ'' کے اندر یہ درس ہے کہ اللہ تعالی کی ذات وصفات محامدات وکمالات میں دوسری کوئی ہستی شامل شریک نہیں ہے بلکہ وہ اکیلا ہی معبود برحق ہے اس کے علاوہ کوئی بھی معبود برحق نہیں ہے باقی سارے اس کی مخلوقات میں سے ہیں جن کو اپنی عبادت کےلیے پیدا کیا ہے ۔جب معلوم ہوا اللہ تعالی سے تعلق پیدا کرنے کےلیے اس کی صفات کا علم ضروری ہے اب ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں کہ اللہ تعالی کا عرش عظیم پر مستوی ہونا بھی اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے جس سے بندوں کو آگاہ کرنا اس لیے ضروری تھا تاکہ ان کو اس بات کا علم ہوسکے کہ اللہ تبارک وتعالی اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد ان سے لاتعلق نہیں ہوا ہے بلکہ جس طرح کوئی بادشاہ تخت بادشاہی پر بیٹھ کر اپنی حکومت چلاتا ہے اس طرح اللہ تعالی اپنے عرش عظیم پر مستوی ہوکر اس کائنات کے کارخانے کو چلارہا ہے اور دنیا کی ہر چیز پر اس کی نظر ہے ۔آسمان وزمین کو اسی نے تھام ہوا ہے ۔جس طرح سورت فاطر میں فرماتے ہیں :

إِنَّ ٱللَّهَ يُمۡسِكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَ ٱلۡأَرۡضَ أَن تَزُولَا (فاطر:٤١)

''اللہ تعالی نے آسمان وزمین کو روکا ہوا ہے تاکہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں ۔''

اسی طرح سورہ ملک میں فرماتے ہیں :

أَوَلَمۡ يَرَوۡاْ إِلَى ٱلطَّيۡرِ فَوۡقَهُمۡ صَٰٓفَّٰتٖ وَيَقۡبِضۡنَ مَا يُمۡسِكُهُنَّ إِلَّا ٱلرَّحۡمَٰنُ إِنَّهُۥ بِكُلِّ شَيۡءم بَصِيرٌ (ملک:١٩)

''یعنی کیا یہ انسان نہیں دیکھتے کہ آسمان وزمین کے بیچ میں جو پرندے صفیں بنا کر اڑتے ہیں اور پھر اپنے پروں کو بند بھی کرتے ہیں ان پرندوں کو فضا کے اندر صرف رحمن ہی نے روکا ہوا ہے بے شک وہ وہی ہر چیز کو دیکھنے والا ہے ۔''

یہ صرف پرندوں کی مثال نہیں ہے بلکہ اس کی ہر چھوٹی بڑی اور جاندار اور بے جان چیز پر نظر ہے کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں کہ وہ اپنی مخلوق سے غافل رہتا ہو،نہ اس کو نیند آتی ہے اور نہ ہی اونگھ اور اپنے عرش سے ہی پورے کائنات کا نظام چلارہا ہے اور ان کے تمام امور میں تدبیر کررہا ہے ۔جس طرح سورہ الم سجدہ میں فرماتے ہیں :

يُدَبِّرُ ٱلۡأَمۡرَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ إِلَى ٱلۡأَرۡضِ (الم سجدة:٥)

یعنی ان کافروں سے تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی پوچھوگے کہ اس کائنات کو کون چلارہا ہے ۔''

تو جو جواب دیں وہ جواب بھی مذکور ہے ۔

فَسَيَقُولُونَ ٱللَّهُ (یونس:٣١)

''یعنی وہ جواب دیں گے کہ یہ کام اللہ تعالی ہی کرتا ہے ۔''

سلف صالحین کا یہ عقیدہ ہے جو کہ صحیح اور اسلم بھی ہے کہ اللہ تبارک وتعالی اپنے عرش عظیم پر مستوی ہوکر پوری کائنات کو چلارہا ہے اگر وہ ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے لیکن اس کا علم اور قدرت ہر جگہ موجود ہے اور مخلوق کے ذرے ذرے کو بھی جانتا ہے ۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا ٱلۡإِنسَٰنَ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِهِۦ نَفۡسُهُۥ (ق:١٦)

''یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں ۔''

إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (الملک:۱۳)

''بے شک وہ سینے کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔''

سورہ آل عمران میں فرماتے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (آل عمران:۵)

''بے شک اللہ تعالی سے کوئی بھی چیز چاہے وہ آسمان ہو یا زمین میں مخفی نہیں ہے۔''

یعنی کے اللہ تعالی کے عرش پر مستوی ہونے کے باوجود اس کا علم وقدرت ہر جگہ موجود ہے، کوئی بھی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اللہ تعالی کی تمام صفتیں بے مثل ہیں۔ یعنی عرش پر مستوی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح دنیا کے بادشاہ کسی بنائے ہوئے تخت پر بیٹھ کر بادشاہی چلاتے ہیں عین اسی طرح اللہ کے لیے بھی کوئی تخت ہے جس پر وہ بیٹھ کر وہ بادشاہی چلاتا ہے۔ اس طرح ہرگز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالی کے عرش کے متعلق یا اس کی کیفیت کے متعلق ہمیں کوئی بھی علم نہیں ہے صرف اتنا علم ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے لیے عرش عظیم کو پیدا کیا جس کے لیے ضروری تھا وہ اس کی شایان شان و عظمت و کبریائی کے مطابق ہو باقی اس پر اس کی ستوی کیفیت یہ بے مثل ہے کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اور ذات اور صفات کے اعتبار سے کوئی بھی اللہ کے مثل یا نظیر نہیں بن سکتا۔

خلاصہ کلام کے اللہ تعالی کا ساتویں آسمان کے اوپر عرش عظیم پر مستوی ہونا بے مثل ہے جس کی کوئی بھی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی ہاں اس کی قدرت و علم ہر جگہ موجود ہے اس کے برخلاف جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور اشاعرہ یا متکلمین میں سے جو ان کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں انہوں نے استوی میں تاویل کی ہے اور اسے مجاز قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ استوی علی العرش کا مطلب ہے کہ اللہ تعالی عرش پر غالب ہوا یا عرش اس کے قبضے وقدرت میں ہے۔ جس کی دلیل پر وہ ایک شعر بھی پیش کرتے ہیں کہ

''استوی بشر علی العراق من غیر سیف ودم مہراق''

یہاں پر استواء بمعنی استولاء ہے۔ یعنی غالب ہوا، شعر کی معنی ہے بشر غالب ہوا عراق پر بغیر تلوار چلائے ہوئے اور بغیر خون بہائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ استوای کا لفظ کبھی تو بغیر صلہ کے استعمال ہوتا ہے جس طرح قرآن کریم میں اللہ تعالی فرماتے ہیں:

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَ اسْتَوَىٰ (قصص:۱۴)

''اور جب وہ پہنچا طاقت کو اور طاقت تام کو۔''

کبھی یہ ''الی'' اور ''علی'' کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ ''الی'' کی مثال

قرآن کریم میں:

(۱): هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ (البقرۃ:۲۹)

(۲): ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ (حم السجدۃ:۱۱)

سلف کا اجماع ہے کہ یہاں پر اس کی معنی علو وارتفاع ہے اور ''علی'' کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

مثال نمبر۱ : لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُورِهِ (الزخرف:۱۳)

''تاکہ تم ان جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھ کر (سواری کرو)۔''

مثال نمبر۲: وَ اسْتَوَتْ عَلَی الْجُودِیِّ (ہود:٤٤)

''یعنی نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر آکر کھڑی ہوئی۔''

اس طرح کی کئی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں ان تمام سے علو، ارتفاع اعتدال یعنی بلند ہونا، برابر ہو کر بیٹھنا مراد ہے جس پر اہل لغت کا اجماع ہے جب استوی کا صلہ ''علی'' آئے تو ہر جگہ پر معنی بلند نہ ہونا مراد ہوگی جس طرح استوی علی العرش میں ہے۔ تو استوی کو اپنے معنی سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے؟ مجاز والی بات قطعا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ مجاز وہاں پر مراد لیا جاتا ہے جہاں پر حقیقت متعذرہ ہو، یہاں حقیقی معنی ہرگز متعذرہ نہیں ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ حقیقی معنی میں مخلوقات کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے تو یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ ''استوی علی العرش'' اللہ کی صفت ہے اور اللہ تعالی کی صفت ویسے ہی بے مثل ہیں جیسے اس کی ذات بے مثل ہے اور مجازی معنی مراد لینے کی دوسری صورت اس وقت پیش آئے گی جب مجازی معنی والے الفاظ دوسری جگھوں پر زیادہ آئے ہوں ایک یا دو جگھوں پر ایک لفظ آیا ہو جس کے حقیقی معنی ان زیادہ الفاظ کے مخالف ہو پھر ان متعدد مواضع کو مد نظر رکھ کر ایک جگہ پر وارد لفظ کو بھی ان پر محمول کیا ہے لیکن یہاں پر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ استوی کی معنی استعلاء یا غلبہ اس کی حقیقی معنی نہیں ہے بلکہ معنی ہے لہذا ''استوی علی العرش'' کو اس مجاز معنی پر محصول کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آتی جب قرآن کریم میں متعدد بار استولاع علی العرش'' کے الفاظ آتے ہیں اور پھر ایک دو جگھوں پر ''استوی علی العرش'' کے الفاظ آتے تو پھر ہم اس کی معنی ''استولاع علی العرش'' کرنے کے مجاز ہوتے لیکن قرآن کریم میں ''استولاع علی العرش'' کے الفاظ ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس ''استوی علی العرش'' کے الفاظ ایک دو کیا بلکہ سات آیات میں وارد ہوئے ہیں جن کی تفصیل ہم گزشتہ اوراق میں کر چکے ہیں۔ لہذا ''استوی علی العرش'' کی معنی ''استوی لاع'' کرنا اصولا بھی غلط ہے اور دوسرا استعلاع اور غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز پہلے قبضہ میں نہیں تھی اس پر غلبہ حاصل کر کے اپنے قبضہ میں کیا جس طرح مذکورہ شعر کا مطلب وہ حضرات اس طرح کرتے ہیں کہ بشر کے قبضہ سے عراق پہلے باہر تھا پھر اس پر غلبہ حاصل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح کے معنی اللہ تعالی کے قبضے اور قدرت سے ایک لمحہ بھی باہر نہ تھی نہ ہے اور نہ ہی کبھی ہوسکے گی اس لیے استعلاء اور غلبہ کا مطلب یہاں پر سراسر بے معنی ہے اور دوسری بات کہ عرش تو زمین و آسمان کی پیدائش سے بھی پہلے سے موجود تھا جس طرح اللہ تعالی فرماتے ہیں :

وَہُوَ الَّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِی سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ (ھود:۷)

''اور اللہ تعالی وہ ذات ہے جس نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اس حال میں کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔''

عربی گرامر کا قاعدہ ہے کہ کسی جملہ میں جو حکم ہے وہ اگر جملہ حالیہ کے واو کے ساتھ مقید ہے تو وہ جملہ حالیہ اس حکم یا خبر سے پہلے ہی ہوتا ہے۔ مثلا کہا جائے ''جاء زید و ہو راکب'' یعنی زید آیا اس حال میں کہ وہ سوار تھا۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ زید کے آنے سے پہلے ہی اس کے ہونے کی اس جملہ میں دلالت ہے، اس طرح اس آیت کریمہ کا بھی یہی مطلب ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے ہی عرش پیدا ہو چکا تھا۔ اس وقت عرش پانی پر تھا اگر عرش پہلے سے موجود تھا تو اللہ تعالی نے یوں کیسے فرما دیا کہ :

ہوالَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (الحدید:٤)

"وہ ذات جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا۔"

وغیرہا من الایۃ کیونکہ ''ثم تراخی'' اور ترتیب کے لیے آتا ہے۔ اگر یہاں پر استوای سے مراد استعلاع لیا جائے گا تو معنی یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد عرش پر غلبہ حاصل

ہوا۔ حالانکہ قرآنی نص اور بخاری وغیرہ کی صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش، زمین و آسمان سے پہلے پیدا ہوچکا تھا، جس پر پہلے ہی اللہ تعالی کو غلبہ اور قبضہ حاصل تھا تو اگر استعلاع کے معنی کروگے تو مطلب یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کے بعد اس پر غلبہ حاصل ہوا ہے یہ صریح تناقض ہے جس سے اللہ کا کلام پاک ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں :

وَلَوْكَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (النساء:۸۲)

''یعنی اگر قرآن مجید اللہ کی کلام نہ ہوتی تو اس میں بہت زیادہ اختلاف و تناقض دیکھنے میں آتا۔''

لیکن اگر اس کا معنی یہ کیا جائے کہ زمین و آسمان کے پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالی عرش پر مستوی ہوا تو اس معنی سے کوئی خرابی نہیں آتی، یعنی عرش عظیم کی تخلیق تو پہلے ہی ہوچکی تھی مگر اس پر استواء زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا۔ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اور تناقض و تعارض کا شائبہ ہی ہے۔ ''فلیتامل متاملون'' باقی جو شعر پش کیا گیا ہے اولا تو اس کے قائل کا کوئی پتہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ عربوں کے کسی دیوان میں ملتا ہے اس کے باوجود اس شعر میں ایک آدمی کا عراق پر غلبہ کا ذکر ہے اور یہ اس لیے بات صحیح ہوسکتی ہے کہ کوئی ملک کسی کے قبضہ میں نہ ہو پھر اس پر غلبہ حاصل کرکے قبضہ میں لے آتا ہے۔ لیکن اللہ تعالی کے بارے میں یہ معنی قطعا درست نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ اس کی قدرت سے کوئی بھی چیز پہلے یا بعد میں باہر نہیں ہوسکتی، اس لیے اللہ کا عرش پر مستوی ہونا اس معنی کا ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا کہ عرش اس کے قبضہ میں نہیں تھا پھر اس پر غلبہ حاصل ہوا۔ لہذا ''اللہ تعالی کا عرش پر مستوی ہونا'' کی صحیح معنی وہی ہے جو لغت عرب کی روء سے متبادر ہے جس کی مثال پہلے ذکر کرچکے ہیں وہی معنی ہے جس کو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین نے ان الفاظ سے سمجھی ہے۔

علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ پش کردہ شعر میں استوی بمعنی استعلاء کے نہیں ہے بلکہ اس کی وہی اصلی معنی ہوگی وہ اس طرح کہ بشر جو کہ عبدالملک بن مروان کے بھائی تھے اور وہ عراق کے امیر تھے۔ سابقہ امراء بادشاہوں اور حاکموں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی ملک کی باشاہی کے لیے آتے تو وہ اپنے تخت شاہی کے اوپر آکر بیٹھتے تھے۔ اسی طرح یہ بشر بھی عراق کا امیر بننے کے بعد اپنے تخت پر مستوی ہوکر بیٹھ گیا اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے اس لفظ کو اپنی اصلی اور حقیقی معنی سے خارج کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی بہرحال یہ شعر ہرگز حجت نہیں ہے کہ ''ثم استوی علی العرش'' کے معنی استعلاع یا غلبہ ہے جب کہ اس جگہ حقیقی معنی متعذرہ نہیں ہے تو پھر مجازی معنی کی طرف جانا اصولا غلط ہے قرآن کریم میں کتنے ہی مقامات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالی تمام مخلوق سے بلند ہے اور انسانی فطرت بھی یہی بتلاتی ہے مثلا جب بندہ دعا مانگتا ہے تو اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے نبی کریم ﷺ دعائے استسقاء کے اندر ہاتھوں کو اتنا بلند اٹھاتے تھے کہ بغلوں کی سفیدی نظر آتی تھی اگر اللہ تعالی ہر جگہ موجود ہوتے تو پھر ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھانے کی ضرورت ہی پش نہ آتی بلکہ وہ کام ہی فضول بن جاتا، اس طرح صحیح حدیث کے اندر آتا ہے کہ ایک شخص اپنی لونڈی کو نبی کریم ﷺ کے پاس لے کر آیا جو کہ رقبہ مومنہ کو آزاد کرنا چاہتا تھا آپ نے اس لونڈی سے سوال کیا ''این اللہ'' اللہ کہاں ہے؟ تو انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ تو انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ آپ اللہ کے رسول ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو آزاد کردو یہ مومنہ ہے، اگر اللہ تعالی آسمان کے اوپر نہ ہوتے تو آپ ﷺ باندی کے اشارہ کو کس طرح بحال رکھتے اور کس طرح اس کو مومنہ قرار دیتے؟ اللہ کے رسول سے بڑھ کر کس کو اللہ کے بارے میں معرفت ہوسکتی ہے۔ حجۃ الوداع والی حدیث تو بالکل مشہور ہے جس میں آپ ﷺ نے لوگوں کو چند باتیں پوچھنے اور سمجھانے کے بعد ان سے سوال کیا کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ تو سب نے جواب دیا یہ ہاں! آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا۔ اس پر آپ نے اپنی انگلی مبارک آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا۔ ''اللھم اشھد'' اے اللہ اس بات پر گواہ رہنا کہ میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا ہے۔ اگر اللہ کے لیے علونہ ہوتا بلکہ وہی ہر جگہ بذات خود موجود ہوتا تو آپ اپنی انگلی آسمان کی طرف نہ اٹھاتے۔ اسی طرح احادیث صحیحہ میں رات کے آخری حصہ میں دنیائے آسمان پر اللہ تعالی کے نزول کا ذکر موجود ہے اگر اللہ تعالی ساتوں آسمانوں سے اوپر عرش عظیم پر نہ ہوتے تو نزول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ باقی ان صفات کی کیفیت کے بارے میں کوئی علم ہے اور نہ ہی ہوسکتا ہے اس لیے اس میں تاویلات وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم اعلان کرتا ہے :

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (بنی اسرائیل:۳٦)

''ایسی بات کے پیچھے مت پڑو جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔''

کتاب وسنت میں جو اللہ تعالی کی صفات وارد ہیں ان پر اسی طرح ایمان لانا ہے جس طرح وارد ہوئی ہیں ۔ باقی کیفیات کا علم اللہ تعالی کے سپرد کرنا ہے ۔ باقی قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے :

وَہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ (الحدید:۴)

اور اسی طرح سورہ مجادلہ میں ہے :

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ مَا یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ہُوَ رَابِعُہُمۡ وَلَا خَمۡسَۃٍ اِلَّا ہُوَ سَادِسُہُمۡ وَلَاۤ اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِکَ وَلَاۤ اَکۡثَرَ اِلَّا ہُوَ مَعَہُمۡ اَیۡنَ مَا کَانُوۡا------الایۃ (المجادلہ:۷)

ان آیات میں اللہ تعالی کا ہمارے ساتھ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ علم اور قدرت کے لحاظ سے ہمارے ساتھ ہے ، یعنی وہ ہم سے علوشان کے لحاظ سے بہت بلند اور عرش عظیم پر ہونے کے باوجود ہماری ہر نقل وحرکت کا علم رکھتا ہے ۔ خود اسی سورہ مجادلہ کے بارے میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی ، بی بی صاحبہ کا گھر مسجد سے متصل تھا کہتی ہیں کہ میں سنتی ہوں کہ عورت آپ ﷺ سے اتنی ہلکی آواز میں گفتگو کر رہی تھی کہ میں نہ سمجھ سکی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن پاک ہے وہ ذات مبارکہ جو ہر وقت دنیا کی آوازوں کو سنتی ہے اس نے ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش عظیم پر اس عورت کا محاورہ سن لیا ۔ اور فوراً وحی نازل کر کے اس عورت کے مسئلہ کو حل کیا اور اس کی شکایت کو دور کیا ۔ جیسا کہ سورت کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے ۔

قَدۡ سَمِعَ اللّٰہُ قَوۡلَ الَّتِیۡ تُجَادِلُکَ فِیۡ زَوۡجِہَا وَتَشۡتَکِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ۖ وَاللّٰہُ یَسۡمَعُ تَحَاوُرَکُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ (المجادلۃ:۱)

''بے شک اللہ تعالی نے سن لیا اس عورت کا قول جو اپنے خاوند کے بارے میں شکایت کر رہی تھی اللہ تعالی آپ دونوں کی گفتگو کو سن رہا ہے بے شک اللہ تعالی سننے والا اور دیکھنے والا ہے ۔''

بہر حال اللہ تعالی کی معیت کا مطلب جو ہم نے لیا ہے وہی متفقہ طور پر سلف صالحین سے منقول ہے باقی اللہ تعالی ہر جگہ باعتبار ذات موجود ہونے کا عقیدہ یا حلولیین ، زندقین کا ہے یا متاخرین ، متکلمین اور آج کل کے دیوبندی حضرات کا ہے جو کہ سلف صالحین کے عقیدے کے برخلاف ہے ۔ قرآن کریم میں تحویل قبلہ کے بارے میں ہے :

قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡہِکَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَۃً تَرۡضٰىہَا (البقرۃ:۱۴۴)

''بے شک ہم آپ کے بار بار چہرہ آسمان کی طرف کرنے کو دیکھ رہے ہیں پھر ہم ضرور اس قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم کریں گے جس کو آپ پسند کرتے ہیں ۔''

نبی ﷺ بار بار آسمان کی طرف کیوں دیکھتے تھے ؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ چونکہ وحی آسمان سے نازل ہوتی تھی آپ اس شوق میں بار بار اوپر دیکھتے کہ کب وحی نازل ہوتی ہے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم کی ، اور وحی کا اوپر سے نازل ہونا اس حقیقت پر واضح دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالی ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے اور وہیں سے وحی کو نازل کرتا ہے تو خود قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالی آسمانوں سے اوپر سے اسی طرح اللہ تعالی فرماتے ہیں :

بَل رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ (النساء:۱۵۰)

''کہ اللہ تعالی نے عیسی کو اپنی طرف اٹھالیا ۔''

احادیث صحیحہ جو کہ تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہیں ان میں اس کی تفسیر اس طرح ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت عیسی علیہ السلام کو زندہ آسمان کی طرف اٹھالیا اگر اللہ تعالی آسمانوں سے اوپر نہ ہوتے تو یوں کس طرح فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا ، آخر میں اتنا عرض کریں کہ جو لوگ اللہ تعالی کے ہر جگہ حاضر ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں یا اس کے قائل ہیں تو ان کے اس قول سے یہ بات لازم آئے گی کہ نعوذ باللہ ، اللہ تعالی ، بیت الخلاء ، گندی جگہیں ، بداخلاقی کے محلات اور شراب وزنا کے اڈوں میں موجود ہیں ۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں جو

خرابی لازم آئے گی اس کی سنگینی کوئی بھی عقلمند انسان بے خبر نہیں رہ سکتا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت مروی ہے جو کہ مسند احمد، ابن ماجہ، نسائی، ابن ابی حاتم اور ابن جریر کی تفاسیر اور عثمان بن سعید داری اپنی کتاب ''الرد علی بتر المریس'' میں لائے ہیں جس کو امام بخاری اپنی صحیح کے اندر کتاب التوحید کے عنوان کے ساتھ تعلیقا جزم کے صیغہ سے ذکر فرمایا ہے۔ یہاں پر ہم امام احمد کے الفاظ نقل کرتے ہیں :

((عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت الحمد للہ الذي وسع سمعۃ الاصوات لقد جاءت المجادلۃ الی النبی ﷺ تکلمۃ وانا فی ناحیۃ البیت ما اسمع ما تقول فانزل اللہ عزوجل قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا .)) مسند احمد 'رقم الحدیث ۲٤۱۹۵' ابن ماجہ فی المعجم المقدمۃ 'رقم ۱۸۸.

''تعریف اس پاک ذات کی جس کا سمع تمام آوازوں سے کشادہ ہے البتہ تحقیق ایک عورت آئی جو کہ نبی ﷺ کے مجادلہ کرنے والی تھی اور آپ ﷺ کے ساتھ محو گفتگو تھی اس حال میں کہ میں گھر کے اندر موجود ہونے کے باوجود نہ سمجھ سکی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے پھر اللہ تعالی نے قَدْ سَمِعَ اللَّهُ والی آیات نازل فرمائیں۔''

اور ابن ابی حاتم کی تفسیر میں اس طرح کے الفاظ ہیں :

((تبارک الذی اوعی سمعہ کل شیٔ انی لا سمع کلام خولۃ بنت ثعلبۃ ویخفی علی بعضہ وہی تشتکی زوجہا الی رسول اللہ ﷺ الی اخرہ))

''یعنی برکت والی ہے وہ ذات جس کا کان ہر چیز کو سمجھتا ہے بیشک میں خولہ بن ثعلبہ کا کلام سن رہی تھی اور کچھ میرے اوپر مخفی رہا اور وہ نبی ﷺ کے پاس اپنے خاوند کی شکایت کر رہی تھی۔''

امام دارمی اپنی کتاب ''الرد علی بتر المریس'' میں صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ :

((قبض رسول اللہ ﷺ قال ابو بکر رضی اللہ عنہ أیہا الناس ان کان محمد الهکم الذی تعبدون فإنہ قدمات وإن کان الهکم اللہ الذي فی السمآء فان الهکم لم یمت))

''جب نبی ﷺ نے اس دنیا سے رخصت فرمائی تو اس وقت سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : اے انسانو! اگر تمہارے معبود محمد ﷺ تھے تو بیشک وہ فوت ہو چکے اگر تمہارا معبود اللہ ہے جو کہ آسمان میں ہے تو وہ فوت نہیں ہوا ہے۔''

امام دارمی اسی کتاب کے اندر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے روایت نقل کرتے ہیں کہ :

''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ان کی وفات کے وقت آئے تو انہوں نے اس وقت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں چند باتیں کیں ان میں سے یہ بات بھی تھی کہ :

((وانزل اللہ براءتک من فوق سبع السموت وجاء بہ الروح الامین))

''یعنی اللہ تعالی نے تیری براءت ساتوں آسمانوں کے اوپر سے نازل فرمائی جس کو روح الامین جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے۔''

اسی کتاب میں امام دارمی صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ انہوں نے فرمایا :

((ما بین السماء الدنیا والتی تلیہا مسیرۃ خمس مائۃ وبین کل سماء مسیرۃ خمس ماۃ عام وبین السماء السابعۃ وبین الکرسی خمسۃ مائۃ عام والعرش علی الماء واللہ ترفوق العرش وہو یعلم ما انتم علیہ)) (بحوالہ الدر المنثور جلد ۱ 'ص ۹۲)

''آسمان دنیا اور جو اس کے ساتھ متصل ہے ان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور ہر دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کرسی کے بیچ میں سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور اللہ تعالی کا عرش پانی پر ہے۔''

اسی طرح ایک اور واقعہ ہے جس میں ایک شخص نے کہا اے ابو عبداللہ، اللہ رحمن عرش پر مستوی ہے اس کے استوی کی کیفیت کیا ہے پھر امام نے سر جھکایا اور ان کو پسینہ آنا شروع ہوگیا پھر سر اوپر اٹھایا اور کہنے لگے (یقینا) اللہ رحمن اپنے عرش پر مستوی ہے جس طرح اپنی ذات پاک وصف بیان فرمائی ہے اس طرح کہنا ہی نہیں ہے اور کیفیت نا معلوم ہے تو برا آدمی اور صاحب البدعۃ دکھائی دیتا ہے اس کو یہاں سے نکال دو امام عثمان بن سعید دارمی اپنی کتاب ''الرد علی الجہمیہ'' میں سورہ مجادلہ کی آیت کریمہ مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلہ :٧) کے متعلق وضاحت کرتے ہیں:

((انما یعنی انہ حاضر کل نجوی ومع کل احد من فوق العرش بعلمہ لان علمہ بھم محیط وبصرہ فیہ فاضل لایحجبہ شئی عن علیہ وبصرہ ولا یتوارون منہ بشئی وھو بکمالہ فوق العرش))

''یعنی اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ یقیناً اللہ تعالی اپنے عرش کے اوپر اپنے علم سے ہر سرگوشی اور ہر ایک کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کے علم نے تمام چیزوں کو گھیرا ہوا ہے کوئی بھی چیز اس کے علم اور ان کو دیکھنے سے روک نہیں سکتی اور نہ ہی انسان اس سے چھپ سکتے ہیں وہ اپنے کمال قدرت سے عرش کے اوپر ہے۔''

امام دارمی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے بارے میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ حاظر ناظر ہے لیکن اپنے علم اور قدرت کے لحاظ سے نہ کہ اسی طرح جس طرح بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ وہ بذات خود ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ اس کی تردید ہم پہلے کر چکے ہیں۔ امام حاکم نیساپوری اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث صفحہ نمبر ٨٤ پر اپنے سند سے امام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ صاحب الصحیح سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

[من لم یقربان اللہ تعالی علی عرشہ قد استوی فوق سبع السموت فھو کافر بربہ یستتاب فان تاب وان لاضرب عنقہ والقی علی بعض مذابل حیث لایتاذی المسلون والمعاہدون بنتن ریح جیفتہ وکان مالہ فیئا لایرثہ احد من المسلمین اذ المسلم لایرث الکافر کما قال ﷺ))

''یعنی جس آدمی نے یہ اقرار نہ کیا کہ یقیناً اللہ تعالی ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے تو وہ اپنے رب کے ساتھ کفر کرنے والا ہے اس سے توبہ کروائی جائے گی پھر اگر توبہ کی تو فبہا وگرنہ اس کی گردن ماردی جائے گی اور اس کو اٹھا ر گندگی کے ایسے ڈھیر پر پھینکا جائے گا جس سے مسلمانوں یا ذمی کو اس کی بدبو تکلیف نہ پہنچائے اور اس کا مال فی بن جائے گا کوئی مسلمان اس کے مال کا وارث نہیں بنے گا کیونکہ مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا جس طرح نبی ﷺ کا فرمان مبارک ہے۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

فتاویٰ راشدیہ

صفحہ نمبر 126

محدث فتویٰ